بچھڑ گئے

سانحۂ مشرقی پاکستان کی تجزیاتی خودنوشت

کرنل زیڈ آئی فرخ

جہلم، پاکستان

Bichar Gaye
by Col. Z. I. Farrukh
Jhelum: Book Corner. 2022
510p.
1. Autobiography - History
ISBN: 978-969-662-422-6

بانی مہتمِم اعلیٰ: شاہد حمید

ناشرین: گگن شاہد * اَمر شاہد

اشاعت: فروری ۲۰۲۲ء

کتاب: بچھڑ گئے

مصنف: کرنل زیڈ آئی فرخ

لفظ خواں: ظفر حسن رضا

سرورق: محمد شکیل طلعت

تزئین وزیبائش: ابوامامہ

خطّاط: احمد علی بھٹہ

کمپوزنگ وصفحہ سازی: محمد عمر فاروقی

کتابت: نُوری نستعلیق، جلال ایل ٹی

مطبع: مکتبۂ جدید پریس، لاہور

ناشر: بک کارنر

ویب سائٹ: www.bookcorner.com.pk

بک سٹور: بک کارنر شورُوم، بالمقابل اقبال لائبریری، اقبال لائبریری روڈ، جہلم، پاکستان 49600

00 92 544 278051, 00 92 544 614977 00 92 314 4440882, 00 92 321 5440882

bookcornerjlm /bookcornershowroom /bookcorner

bookcornerjhelum info@bookcorner.com.pk

اپنے پوتوں محمد سالار حسن

اور

مصطفیٰ کمال حسن کے نام

تا قیامت

وطنِ عزیز کے تحفظ

اور

قومی پرچم کی سربلندی کی ذمہ داری کے ساتھ!

پیش لفظ (کرنل زیڈ آئی فرخ) ... 11

حصّہ اوّل

امن سے آپریشن سرچ لائٹ تک

30ستمبر 1970ء سے 31مارچ 1971ء تک

عزم و مسرّت کا سفر ... 17

نئی فورس میں شمولیت ... 24

آغازِ کار ... 33

رواں دواں ... 38

سمندری طوفان اور الیکشن مہم ... 49

الیکشن 1970ء اور طاقت کا پس منظر ... 54

1971 - Happy New Year ... 75
مستقبل کا وزیراعظم پاکستان ... 85
تلاطم سے بے نیاز ... 90
صف آرائی ... 102
عوامی لیگ کا ''پُرامن'' احتجاج ... 107
صورتِ شمشیر کون تھا؟ ... 119
آپریشن سرچ لائٹ ... 133

حصّہ دوم

خانہ جنگی

اپریل 1971ء سے نومبر 1971ء تک

سرحد کے آر پار ... 155
پُرامن دَور... ویران شہر، اداس لوگ ... 162
مادھومتی ... 179
سلگتے سبزے ... 189
Happy Birthday ... 198
عشق نے پتّھروں پر سفر جاری رکھا ... 216
مون سون کے بعد ... 231
خزاں کے سائے ... 247
بے چینی بوجہ بے یقینی ... 259

جنگ کی تیاریاں ... 271

عیدالوداع ... 280

- **حصّہ سوم**

جنگ

21نومبر 1971ء سے 16دسمبر 1971ء تک

سرحدوں پر جنگ کے شعلے ... 291

حالتِ برگِ خزاں پیش ... 302

علانیہ جنگ ... 325

جنگ بندی کی تمنّا ... 344

کمک کے دھوکے میں ... 366

آخری آپریشن ... 387

نشیمن نہ چمن میرا ... 398

آشیانے سے قفس تک ... 410

- **حصّہ چہارم**

قید، کیمپ، رہائی اور اعزاز

1جنوری 1972ء سے 23 مارچ 1975ء تک

نو گرفتار پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی ... 429

امید کی کرن ... 445

قید کے شب و روز ... 454

رہائی کی جانب ... 467

مادرِ وطن کی آغوش میں ... 474

اِک ستم اور .... ابھی جاں باقی ہے ... 483

رجمنٹ واپسی کا اعزاز ... 501

پیش لفظ

2018ء کا سال اپنے اختتام کو پہنچ رہا ہے۔ میری قوم پھر سے اپنے زخم کریدنے کے لیے 16 دسمبر کو یومِ سقوط ڈھاکا منائے گی۔ وہی جذبات اور مرثیے سنائی دیں گے جو گزشتہ 47 سال سے اُس وقت پیدا ہونے والے بچے اب اپنی ڈھلتی عمر میں بھی سن رہے ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اس قومی سانحہ کے اصل محرّکات اور ان کا آغاز سے احاطہ کرنے کی کسی محقق نے کوشش ہی نہیں کی۔ بدترین حالات میں بے مثال جرأت سے لڑنے والی اپنی فوج پر حالات سے نابلد تنقید کرنے والوں نے اسے تاریخی طور پر مطعون تو بنا دیا، مگر وہ تمام دریچے بند رکھے جن میں سے جھانک کر آیندہ نسلیں یہ سمجھ پاتیں کہ یہ سانحہ کس طرح 1948ء سے 1971ء تک تیار ہوا۔ اس وقت کے مدبرین، سیاست دان، لکھاری، ماہرینِ تعلیم، بیوروکریٹس اور سوسائٹی کے دیگر متحرک لوگ کتنی بصیرت رکھتے تھے اور انھوں نے ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان یکجہتی یا دُوری پیدا کرنے میں کیا کردار ادا کیا؟ چونکہ دُنیا کی تاریخ میں پہلی اور شاید آخری بار ایک ایسا ملک معرضِ وجود میں آیا جس کے مختلف تہذیبیں رکھنے والے دو خطوں کے درمیان ایک ہزار میل کی تیسری تہذیب موجود ہو۔ لہٰذا اس کی سالمیت اور یکجہتی خصوصی بصیرت اور تدبر کی متقاضی تھی جسے تاریخ کے اوراق میں بھی اجاگر ہونا چاہیے تھا۔

میں 30 ستمبر 1970ء کو نوجوانی کے عمومی خوش فہم جذبات اور بلند و بالا عزائم کے ساتھ اپنے اس بظاہر ہنستے بستے خطۂ وطن میں تعینات ہو کر پہنچا۔ مگر چند ہی دنوں میں احساس ہو گیا کہ یہاں پر فضا خاصی مکدر ہو چکی تھی۔ دبی ہوئی نفرتوں، سہمی ہوئی محبتوں اور چھپائی گئی حقیقتوں نے یکجہتی کے دوغلے نعروں کو جنم دے رکھا تھا۔

7 دسمبر کو جنرل الیکشن ہوا تو سب کچھ کُھل کر سامنے آ گیا۔ بنگال خود مختاری چاہتا تھا، اکٹھے رہ کر یا علیحدہ ہو کر۔ اس کے لیے وہ لوگ سالہا سال کی ارتقائی منازل طے کر کے یکجا ہو چکے تھے۔ مغربی پاکستان میں اس کا ادراک اگر کہیں تھا بھی تو اسے ڈھانپ کر رکھا گیا تھا۔

بنگال میں مغربی پاکستان کے چار جرنیل ہی کرتا دھرتا تھے۔ وائس ایڈمرل ایس ایم احسن گورنر، لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب علی خان کمانڈر ایسٹرن کمانڈ، میجر جنرل راؤ فرمان علی مارشل لا ایڈوائزر اور میجر جنرل خادم حسین راجا جی او سی 14 ڈویژن ڈھاکا تعینات تھے۔ ان چاروں نے مرکزی حکومت کو صاف لکھ دیا تھا کہ وہاں کے حالات اب صرف سیاسی حل چاہتے تھے اور کسی طرح کا بھی فوجی آپریشن ملکی مفاد میں نہ تھا۔ انھیں ہٹا دیا گیا اور ہم کوتاہ نظروں کے نعروں کے تابع ہو گئے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان میں حکومتی عہدے داروں، سیاستدانوں، دانشوروں، لکھاریوں اور عام پبلک کا اس پر کیا ردِّعمل تھا؟ جاننے کی ضرورت ہے۔ کیا وہ یحییٰ خان کی فہم و فراست پر اندھا دھند یقین رکھتے تھے، صدر کے خاموش معاون تھے یا پھر اپنے قومی فریضے سے غافل رہے۔

الیکشن کے بعد دونوں خطوں کے درمیان دُوریاں بڑھنے کا عمل تیز تر ہو گیا۔ مارچ 1971ء کے پہلے ہفتے میں مشرقی پاکستان مکمل طور پر مجیب الرحمٰن کے قبضے میں جا چکا تھا۔ پھر بھی ملٹری آپریشن ہوا اور بھارتی سپورٹ کے ساتھ بغاوت ہو گئی۔ 8 ماہ کی خانہ جنگی سے گزر کر ہماری بے سر و سامان مٹھی بھر فورس کو ساڑھے تین انڈین کور، 40 بی ایس ایف بٹالین، ڈیڑھ لاکھ مکتی باہنی گوریلوں اور ان کے کروڑوں ہمدردوں کے ساتھ جنگ لڑنی پڑی۔ جبکہ ہمارے پاس دشمن کی

بحری اور فضائی طاقت کا مقابلہ کرنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ ہماری طاقت کا محور مغربی پاکستان، 4/5ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر ہم سے لاتعلق بیٹھا رہا۔ نتیجتاً بنگال کو آزادی اور ہمیں ہزیمت ملی۔ ہزاروں مغربی پاکستانی، بہاری اور محبِ وطن بنگالی پاکستان کی ناموس پر قربان ہو گئے اور ہزاروں کو دُشمن کا قیدی بھی بننا پڑا۔

میں ان سارے حالات سے گزرا ہوں۔ میری تعیناتی بھی ایسی جگہ تھی جہاں پر اس خطے میں روپذیر ہونے والے واقعات کا زیادہ سے زیادہ علم ہو جاتا تھا۔ پھر تقریباً ان معاملات پر پڑھے لکھے جاہلوں اور جذباتی پاکستانیوں کے ظالمانہ سوالات کے مقابلے میں ''جوتن لاگے سوتن جانے'' کے مصداق وہاں کے متاثرین کے جوابات بھی سنے۔ اب جس وقت بنگال میں لڑنے والے مجاہد آہستہ آہستہ دنیا سے روپوش ہو رہے ہیں، میں نے سوچا کہ جو حقائق میں جانتا ہوں وہ من وعن لکھ کر تاریخ کو نذرانہ پیش کر دوں۔ تاکہ آیندہ نسلیں جان سکیں کہ وطن کی آن پر آج شہید ہونے والوں کی تاریخ میں سرفروشی کبھی بھی کم نہ تھی۔ ہار جیت کے محرکات اور بہت سارے ہوتے ہیں۔

میں نے اپنی ساڑھے چار سال کی کہانی لکھی ہے۔ اپنے آپ کو کسی ایک موضوع میں محدود کرنے کی بجائے میں نے جو خود دیکھا، خود جانا، میرے ساتھ جو گزری، بطور نوجوان افسر کس جگہ پر کیا جذبات تھے اور آج میں اس کا کیسے تجزیہ کرتا ہوں، سب نہایت ایمانداری کے ساتھ نذرِ قارئین کر رہا ہوں۔ اُمید ہے پڑھنے والوں کو اُس وقت بنگال میں زندگی، عوامی احساسات، تاریخی اور جغرافیائی اثرات اور حالات کے جبر کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ شاید اسی سے ہمارا قومی معاملات میں حقیقتوں کو پہچاننے اور اپنی ذمہ داریوں کے احساس کا عنصر بھی مزید نمو پا جائے۔

میری اس کاوش کی بنیاد میری یادیں ہیں جنھیں میں کبھی نہیں بھلا پایا۔ البتہ کہیں کہیں نوک پلک درست کرنے کے لیے میں نے گُوگل کا سہارا ضرور لیا ہے۔

میں نے کتاب میں مذکور اور اپنے اُس وقت کے ساتھیوں، جنرل ڈاکٹر سہیل جعفری، کرنل جمیل چوہدری اور کرنل طارق سے بھی معاملات پر استفادہ کیا ہے، جن کا میں شکر گزار ہوں۔

پُرانے دوستوں اور میرے بیٹے حسن علی فرخ نے مجھے اپنے عشروں پر محیط بھٹکتے احساسات کو یکجا کرنے کے لیے میری حوصلہ افزائی کی اور محمد اظہر بھٹی نے میرے لکھے کو کتابی شکل میں لانے کا بنیادی کردار ادا کیا۔ میں اس تعاون پر ان سب کا بے حد شکر گزار ہوں۔

میں بک کارنر، جہلم کے مینیجنگ ڈائریکٹر محترم امر شاہد کا بھی تہِ دل سے ممنوں ہوں کہ انھوں نے میری کتاب کو از سرِ نو تزئین و اہتمام کے ساتھ شائع کر کے تمام اہلِ وطن تک پہنچانے کا کردار ادا کیا۔

کرنل زیڈ آئی فرخ

حصّہ اوّل

امن سے آپریشن سرچ لائٹ تک

30 ستمبر 1970ء سے 31 مارچ 1971ء تک

عزم ومسرّت کا سفر

’’خواتین وحضرات! پی آئی اے کی پرواز PK325 پر خوش آمدید۔ ہم ان شاءاللہ دو گھنٹے دس منٹ میں اپنی منزل ڈھاکا پہنچ جائیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے ساتھ آپ کا یہ سفر خوشگوار گزرے گا۔ براہِ مہربانی اپنی سیٹ بیلٹ ....‘‘

یہ 30 ستمبر 1970 کی دوپہر کو لاہور ایئرپورٹ سے روانگی کا اعلان تھا۔

جہاز کی نشستوں پر بیٹھے زیادہ تر لوگ ملازم پیشہ اور کچھ کاروباری سے لگ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر عمومی سے تاثرات تھے مگر پچھلی سیٹوں پر چھ سات نوجوانوں کا گروپ ہر تاثر سے بے نیاز اور ہر فکر سے آزاد، شگفتہ احساسات کے ساتھ چہک رہا تھا۔ یہ پاکستان آرمی کے جونیئر کپتان تھے جو پہلی بار اپنی یونٹوں سے باہر ایسٹ پاکستان رائفلز (EPR) میں تعیناتی پر جارہے تھے۔ ان میں سے ایک مَیں بھی تھا۔

ہم نے اناؤنسمنٹ کے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے سیٹ بیلٹ باندھ کر جو چپ سادھ رکھی تھی، جہاز کے ہوا میں بیلنس ہونے کے ساتھ ہی توڑ دی۔ سب کورس میٹ تھے لہٰذا اپنی اپنی سیٹوں سے اٹھ کر پورے ماحول کو زندگی سے بھرپور کرنے میں بے ساختہ مگن ہو گئے۔ سب سے مزیدار بات یہ تھی کہ نزدیک کی سیٹوں والے لوگ ہماری ہلکی پھلکی باتوں سے محظوظ ہو رہے تھے بلکہ ایک بزرگ تو باقاعدہ ہمارے ساتھی بن گئے۔ ایئر ہوسٹس نے ٹافیاں اور جوس وغیرہ آفر کیا جو

بہت اچھا لگا۔ پورے جہاز کا ماحول خوبصورت تھا۔ اس وقت لوگ اچھے لمحات و احساسات ایک دوسرے سے بانٹ کر زندگی کو جِلا بخشا کرتے تھے۔

ہماری خوش گپیوں کے موضوعات تھوڑی تھوڑی دیر بعد بدل رہے تھے۔ کوئی بھی کم دلچسپ نہ تھا بلکہ یوں سمجھیے کہ سب موضوعات بہ یک وقت زیرِ بحث تھے۔ غالب موضوع مشرقی پاکستان کے متعلق معلومات تھیں۔ جیسے وہاں کے مختلف علاقوں میں پھیلی ہوئی قدرت کی رعنائیاں، طرزِ زندگی، شہروں کے خدوخال اور اس خطے میں طریقۂ سیاحت وغیرہ۔ پھر اس کے بعد ان اضافی مراعات کا ذکر ہوتا رہا جو مشرقی پاکستانیوں کو مغربی پاکستان میں اور مغربی پاکستانیوں کو مشرقی پاکستان میں تعیناتی پر ملتی تھیں۔ ان کے علاوہ اس تعیناتی کے دوران کیریئر کورسز کے مستقبل، واپسی پر گاڑی کا خریدنا اور شادی وغیرہ کے پروگرام کا تذکرہ بھی عام سنائی دیا۔ ان دنوں نئی ٹیوٹا کرونا -/15,000 روپے میں آتی تھی اور ہماری پسندیدہ ذرا سستی کاریں واکس ہال VIVA یا ووکس ویگن تھیں۔ سب وہی خواب دیکھتے جا رہے تھے جو اس عمر کے لوگ اس طرح کے پُرعزم سفر میں دیکھا کرتے ہیں۔

دور دور تک کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ واپسی تک کتنوں کے خواب ریزہ ریزہ ہو چکے ہوں گے۔ کون کون وہاں کے سبزے کی چادر اوڑھ کر ہمیشہ کے لیے سو گیا ہو گا اور کون لوگ آگ و خون کے دریا عبور کرتے ہوئے اُن شہیدوں اور آج کی چہکتی محفل کی کہانیاں سنانے کے لیے رہ جائیں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فوج میں نوجوان افسروں کو ایسے گمان آتے ہی نہیں۔ ان کے اذہان پر پاکستان ملٹری اکیڈمی سے پاسنگ آوٹ پریڈ والی صبح کا نقش راسخ ہوتا ہے۔ وہ معطر صبح، جھنڈیوں اور عسکری شان سے سجا ہوا تاریخی ''کالا گراؤنڈ''، امڈتے ہوئے جذبات اور خوبصورت وردیوں میں ملبوس دستوں کی شاندار انٹری، پھر حلف کے الفاظ کی گونج:

"That I shall go, wherever I may be ordered, by
Land, Air or Sea, even to the Perils of my life"

''یہ کہ میں جاؤں گا جہاں پر بھی جانے کا مجھے حکم ملے گا۔ خشکی، ہوائی یا سمندری ذریعے سے، چاہے اس میں میری جان ہی چلی جائے۔

پھر سلامی، اور گراؤنڈ سے نکلتے وقت بینڈ کی دھن پر نئی زندگی کے آغازِ سفر پر قوم کی طرف سے پیغام ''اے مردِ مجاہد جاگ ذرا اب وقت شہادت ہے آیا۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔''

''خواتین و حضرات! میں آپ کا کیپٹن .... بول رہا ہوں۔ ہم اس وقت نئی دہلی کے اوپر سے گزر رہے ہیں ....'' اس وقت ایئر ہوسٹس کھانے پینے کا سامان فراہم کر رہی تھی۔

29 سالہ کیپٹن شبیر جو عمر میں سب سے بڑے اور سنجیدہ تھے، ان کے سوا سارے کے سارے کھانا پینا چھوڑ کر کھڑکیوں سے جا ٹکرائے۔ زاویے بدل بدل کر دیکھا مگر نیچے کوئی شہر نظر نہ آیا۔ ہمارا یہ تجسس کسی محبت کی وجہ سے نہ تھا بلکہ 5 سال پہلے وطنِ عزیز پر حملہ کرنے والے دشمن سے نفرت اور کالے گراؤنڈ والے عزمِ نو کے تحت انتقام کا آئینہ دار تھا۔ بہر حال ماحول گرم سا ہو گیا اور نہ صرف اُس جنگ میں شامل کچھ سرفروشوں کی شجاعت کے قصے دہرائے گئے بلکہ بزرگوں سے 1947ء کے سنے ہوئے ہندوؤں کے مسلمانوں پر مظالم کا تذکرہ بھی ہوا۔

ہمارے ماحول میں شامل ہونے والے نئے بزرگ دوست نے بھی اپنا قصہ سنایا۔ ان کے بقول وہ پٹنہ کے رہنے والے تھے اور تقسیم ہند کے وقت دلّی میں ملازمت کر رہے تھے۔ وہ کس طرح جان پر کھیل کر اپنے خاندان تک پہنچے اور پھر ہجرت کر کے جیسور میں آباد ہو گئے۔ تاہم انھوں نے چند بوجھل لفظوں میں یہ بھی کہہ ڈالا کہ افسوس ہندوؤں کی بالا دستی سے یہاں پر بھی جان نہ چھوٹ پائی۔ ان کے آخری جملے پر ہم نے دھیان نہ دیا کیونکہ ہم ایک دوسرے کی توجہ اس جانب دلوا رہے تھے کہ جہاز آہستہ آہستہ بلندی کم کر رہا تھا۔

''خواتین و حضرات! آپ کا کیپٹن .... ہم پھر سے پاکستان کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں اور تھوڑی ہی دیر میں ہم اپنے ہرے بھرے سبزہ زاروں اور دریاؤں کی سرزمین پر اترنے والے ہیں۔ آپ کو دریاؤں میں سٹیمر اور کشتیاں تو نظر آ رہی ہوں گی۔ ڈھاکا ایئر پورٹ زیادہ دور نہیں۔ خدا حافظ۔''

اس کے فوراً بعد جہاز سے اترنے کی ہدایات سنائی دے رہی تھیں مگر ہم انھیں نظر انداز کرتے ہوئے کھڑکیوں کے ساتھ چپکے رہے۔ زمینی مناظر بہت خوبصورت اور ہمارے لیے نئے

تھے۔ سہانے احساسات، شوخیٔ شباب اور ایک انجانی مسرّت نے فکر ونظر کو قوسِ قزاح جیسی چھتری سے ڈھانپ رکھا تھا۔

جہاز بظاہر گھنے درختوں کے اوپر پرندے کی طرح بیٹھتا نظر آ رہا تھا مگر انہی سیاہی مائل درختوں کے درمیان تازہ تازہ دھلی ہوئی کالی پٹی کو ٹچ کرتا ہوا محسوس ہوا۔ گویا ہم ڈھاکا ایئرپورٹ کے رن وے پر اتر چکے تھے۔ ایک طرف تھوڑی دور ایئرپورٹ کی سادہ سی بلڈنگ اور اس میں گہما گہمی نظر آ رہی تھی جبکہ دوسری طرف تاحدِ نگاہ گھنے درختوں کی ایک لائن کے پیچھے، پانی اور سبزہ ہی سبزہ تھا۔

درختوں کی لائن کے نیچے تقریباً 4 فٹ قد کے ہلکے سبز اور سفید پتوں والے پودے دور تک قطار میں اس طرح نظر آ رہے تھے جیسے بچّے کسی قومی تہوار پر صف آرا ہوئے ہوں۔ آسمان ابر آلود تھا اور تھوڑی دیر پہلے رن وے کو دھو دینے والی بارش بھی تھم چکی تھی۔ جونہی ہم نے جہاز کی سیڑھی سے اتر کر زمین پر قدم رکھا، پھر سے ہلکی بونداباندی نے ہمیں خوش آمدید کہا۔

یہ کیسا خوابیدہ سا منظر تھا۔ کیا اس سرزمین نے 64 سال پہلے 1906ء میں بھی مسلمانانِ برصغیر کے مختلف علاقوں کے نمائندوں کا خیر مقدم اسی طرح کیا تھا؟ کیا وہ بھی ہماری طرح خوش اور پُرعزم یہاں پہنچے تھے؟ ان کے کندھوں پر قوم کو آزادی دلانے کا بوجھ تھا اور ہم پر آزادی کے تحفظ کا، مگر جس طرح کی تاریخ ساز کامرانی وہ یہاں سے سمیٹ کر لوٹے تھے کیا اس طرح کی کامیابی ہمارے نصیب میں بھی تھی؟ جس طرح خاموش درختوں اور مہربان موسم نے مجھے مسحور کر رکھا تھا، کیا یہاں کے لوگ بھی مجھے اتنا ہی پیار دیں گے؟ دل اس وقت یہاں کی مٹّی سے یہ سوال کرتا رہا، مگر جواب بعد میں وقت نے دیا۔

سامان وصولی کے وقت وہاں پر تعینات دو تین بنگالی اہلکاروں سے خوش کلامی کی کوشش کی مگر وہ اس طرح سے پیش آئے جیسے وہ ہماری مسکراہٹوں کو یکسر سمجھنے سے قاصر ہوں۔ تھوڑی ڈھٹائی سے پھر بات چیت کرنے کا آغاز اپنے ایک بیگ کے نظر نہ آنے پر کیا۔ اُن میں سے ایک آدمی نے مجھے بیگ تولا کر دے دیا مگر پکڑاتے وقت منہ دوسری طرف ہی رکھا۔ بہرحال میں نے اس کی

پشت پر ہی اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے، اپنے تین بیگ پر مشتمل سامان کو ٹرالی میں رکھنا شروع کر دیا۔

اتنے میں ایک ہنس مکھ سا بنگالی پورٹر میرے پاس آیا اور نہایت ادب سے اپنی خدمات آفر کیں۔ میں سامان اس کے حوالے کر کے اس کے ساتھ باہر کی طرف چل پڑا۔ اسے اندازہ تھا کہ میں پہلی بار یہاں آیا ہوں لہٰذا وہ ویلکم انداز میں مجھ سے بولے جا رہا تھا۔ اس کی ہر بات سے پیار اور عزت کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں بھی اس کی باتوں کا جواب اسی طرح دے رہا تھا۔ البتہ میرا ذہن پہلے والے اہلکاروں کے رویے میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ پڑھے لکھے مگر بے مروّت تھے، جبکہ یہ اَن پڑھ مگر مہربان۔ ایسا کیوں تھا؟ میں نے پورٹر کو دس روپے دیئے جو اس وقت ایک من گندم کے برابر تھے مگر اس نے جس طرح دعائیں دیں شاید اسی کے بدلے کا رزق مجھے آج تک مل رہا ہے۔ چند ہی دنوں میں مجھ پر آشکار ہو گیا کہ دونوں رویوں کے درمیان فاصلہ آگہی کی ایک خطرناک قسم تھی جس نے بچی کھچی باہمی تسلیم کو جلد ہی نگل جانا تھا۔

بلڈنگ کے برآمدے میں خاکی وردی پر کالے بٹن اور EPR کے بیج لگائے پانچ چھ بنگالی جوان نظر آ رہے تھے، ہم اس طرف چل دیئے۔ ان سے چند قدم پہلے دو افسروں نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ یہ ہماری ریسیپشن کے لیے آنے والے EPR سے کیپٹن چوہدری محمد صدیق اور کیپٹن فاروق خٹک تھے۔ بڑی گرمجوشی سے ملنے کے بعد ہم باہر کھڑی ہوئی پولیس سٹائل نیلے رنگ کی جیپوں میں بیٹھ گئے اور سامان جوانوں نے سنبھال لیا۔ ہمیں وہاں سے 6/7 کلومیٹر دور EPR ہیڈکوارٹرز جانا تھا، جسے پیل خانہ کہا جاتا تھا۔ دراصل پہلے اس بڑے کمپاؤنڈ میں فیل (ہاتھی) رکھے جاتے تھے اور اسی نسبت سے نام چلا آ رہا تھا۔

ہمارے جیپوں میں بیٹھنے تک بارش پھر سے شروع ہو چکی تھی۔ ہم ایئرپورٹ کی حد پر مشہور فارم گیٹ سے نکل کر ڈھاکا کے پوش ایریا میں داخل ہو رہے تھے۔ ہر طرف بے داغ سبزے اور بے خار پودوں نے رنگ جما رکھا تھا اور ان کے درمیان پھنسی ہوئی کالی سڑک بارش میں بہت خوبصورت منظر پیش کر رہی تھی۔ چند منٹ ہی چلے ہوں گے کہ اس تصویر کا دوسرا رخ بھی سامنے آ

گیا۔ سڑک پر تین چار سائیکل رکشے جا رہے تھے جنھیں وقت سے پہلے بوڑھا ہو جانے والے ناتواں چلا رہے تھے۔ میں نے زندگی میں یہ منظر پہلی بار دیکھا تھا۔ کیا ہر پل برسنے والی بارشوں کی بدولت اُگنے والی ہریالی میں ان کی قسمت کے کوئی پھول نہیں کھلتے تھے؟ کیا انھوں نے نواب سراج الدّولہ کے جذبۂ حریت کچلے جانے کے بعد اپنے اندر خوئے غلامی پال رکھی تھی؟ اگر ایسا ہوتا تو پاکستان کی جدوجہد آزادی کا آغاز ڈھاکا سے کیسے ہوتا؟ نہیں! ان کا اپنی قسمت بدلنے کا سفر خاموشی سے جاری تھا جس طرح لاوہ زمین کے اندر مناسب وقت اور کمزور چٹانوں کی تلاش میں صدیوں سفر کرتا رہتا ہے۔ یہ خیالات اب ماضی کے جھروکوں میں امڈتے نظر آتے ہیں ورنہ اس وقت تو ہم فقط تفاخر سے مخمور ہو رہے تھے۔

دھان منڈی کے عالیشان بنگلوں کے اندر سے گزرتے ہوئے ہم فیل خانہ گیٹ میں داخل ہو گئے۔ اونچی دیواریں اور پُرانے درخت واقعی فیل خانہ کی یاد دلا رہے تھے مگر اس کے اندر سرخ رنگ کی بیرکیں نئی دنیا کا احساس دلا دیتیں۔ ہمیں سیدھا میس میں لے جایا گیا جسے EPR کلب کہا جاتا تھا۔ ہمارا سامان ساتھ والے گیسٹ رومز میں پہنچا دیا گیا۔ پُرتکلّف ظہرانے کا انتظام تھا جسے ہم نے ہائی ٹی سمجھ کر اڑایا۔ ہم یہاں پر دو گھنٹے بیٹھے رہے اور اپنے دونوں میزبانوں سے کھل کر تعارف اور تبادلہ خیال ہوا۔ دونوں آپس میں کورس میٹ اور بے تکلّف تھے۔

کیپٹن صدیق ایک اچھی شخصیت کے ہنس مکھ آدمی تھے۔ اپنا نام ہمیشہ ہی چار منزلہ بتاتے تھے یعنی کیپٹن چوہدری محمد صدیق۔ لائل پور کے قریبی گاؤں کے جٹ تھے اور اپنی لدھیانوی لہجے کی پنجابی کا انگریزی میں بھی بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ ان کے پاس فطرتاً چھپانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا لہٰذا پہلی ملاقات میں ہی ہماری زیادہ بریفنگ انھوں نے کی۔ اگر کوئی اجنبی ان کے ماتھے پر کچھ لکھا ہوا پڑھتا تو وہ ''صداقت'' اور ''وفا'' کے الفاظ ہوتے۔ کیپٹن فاروق خٹک ایک نہایت مدبر، سلجھے ہوئے، کم گو انسان تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ شاعر بھی تھے۔ انھوں نے ہمیں جتنا بھی بتایا وہ ٹو دی پوائنٹ اور معنی خیز تھا۔ ہر بات مونچھوں کے نیچے ہلکی سی مہربان مسکراہٹ لا کر انتہائی غور سے سنتے اور اچھے آپشن بتا کر فیصلہ ہم پر چھوڑ دیتے جبکہ کیپٹن صدیق